۱۹

میاں عزیز احمد صاحب مرحوم کے متعلق اپنوں کے خیالات اور معاندین کے اعتراضات

(فرمودہ ۲۴؍جون ۱۹۳۸ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

''اس ہفتے مجھے پشاور کی جماعت کے ایک دوست کی طرف سے ایک خط ملا ہے جس میں انہوں نے ایک دوسرے دوست کی شکایت کی ہے کہ ایک مجلس میں بیٹھ کر انہوں نے بعض ایسی باتیں کہی ہیں جو قابلِ اعتراض ہیں اور مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں ان باتوں کا ازالہ کر دوں۔ چونکہ وہ باتیں اور ویسی ہی بعض اور باتیں ایسی ہیں جو کسی قدر توضیح چاہتی ہیں اور اس بات کی متقاضی ہیں کہ جماعت کو ان کے متعلق صحیح رائے سے آگاہ کیا جائے اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ میں جمعہ کے خطبہ میں ان امور کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر دوں:-

انہوں نے دو باتیں لکھی ہیں۔ ایک تو یہ ہے۔ کہ اس دوست نے مجلس میں بیٹھ کر بہ اصرار و بہ تکرار یہ بات بیان کی کہ قادیان کے لوگ بے غیرت ہیں کیونکہ وہ سلسلہ اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق یا ان کے خاندان کے متعلق جو بدگوئی کی جاتی ہے اسے برداشت کر لیتے ہیں۔ اور انہوں نے کہا کہ اہلِ قادیان جو یہ کہتے ہیں کہ صبر سے کام لیتے ہیں یہ درست نہیں اس لئے کہ جب انہیں یا ان کے رشتہ داروں کو کوئی شخص گالی دے تو وہ صبر نہیں کرتے۔

وہ کہتے ہیں ہم نے اس دوست کو سمجھایا کہ یوں نہیں کہنا چاہئے۔ تو وہ کہنے لگے میرے ساتھ قادیان چلو۔ میں اسی فیصدی ایسے لوگ ثابت کر سکتا ہوں کہ جب انہیں یا ان کے ماں باپ کو گالی دی جائے تو وہ برداشت نہیں کریں گے اور یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام یا سلسلہ اور نظام کے متعلق جب دشمنوں کی طرف سے کوئی بات کہی جاتی ہے اور وہ اسے برداشت کر لیتے ہیں تو یہ صبر کا نہیں بلکہ بے غیرتی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حالانکہ گالی دینے والے کا علاج سوائے سختی کے اور کیا ہے:

دوسری بات وہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے یہ کہی کہ ان میں سے ایک ہی شخص نے غیرت کا مظاہرہ کیا۔ یعنی میاں عزیز احمد صاحب نے اور انہوں نے اس کی کوئی امداد نہ کی بلکہ خاموش بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ جب اس کی وجہ سے ہائی کورٹ نے خلیفۃ المسیح کے متعلق بعض ریمارکس کئے تو اس وقت جماعت میں جوش پیدا ہؤا۔ اور دوڑ بھاگ کی گئی حالانکہ اگر شروع سے ہی جب یہ واقعہ ہؤا تھا کوشش کی جاتی تو شاید میاں عزیز احمد کو پھانسی نہ ملتی اور وہ بچ جاتے۔

یہ دو باتیں ہیں جو اس دوست نے پشاور سے لکھی ہیں۔ اور تحریر کیا ہے کہ ہم اس دوست کو سمجھاتے رہے اور وہ اصرار کرتے رہے جس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ دوست اور ایسے ہی اگر کوئی اور دوست ہوں تو ان دلوں پر زنگ لگا ہؤا ہے کیونکہ وہ قادیان اور مرکز سلسلہ کا احترام نہیں کرتے اور چونکہ ایسے شخص نے قادیان کے لوگوں کی ہتک کی ہے اور فتنہ پیدا کیا ہے اس لئے اس کا ازالہ ہونا چاہئے۔ یہ تو ایک احمدی اور اپنے دوست کی طرف سے مجھے بات پہنچی ہے۔ نام انہوں نے نہیں لکھا صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ دوست احمدی اور مبائع ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے دو اور باتیں بھی پہنچی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی قابل توجہ ہیں۔ اگرچہ وہ دوستوں کی طرف سے نہیں بلکہ مخالفوں کی طرف سے پہنچی ہیں۔ ان میں سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جماعت احمدیہ کی طرف سے کہا تو یہ جاتا ہے کہ جماعت احمدیہ میاں عزیز احمد کی مدد نہیں کرتی رہی حالانکہ اس کے مقدمات پر ہزار ہا روپیہ خرچ کیا گیا ہے ورنہ ایک غریب آدمی ہائی کورٹ اور پریوی کونسل تک مقدمہ کیونکر لڑ سکتا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک احراری مولوی نے بھی اپنی ایک تقریر میں یہ مضمون بیان کیا ہے۔ ایک اعتراض مخالفوں کی طرف سے یہ بھی میرے کان میں

پڑا ہے کہ میاں عزیز احمد صاحب کے جنازہ میں ہزاروں احمدی شامل ہوئے یہ بغیر حکم کے کس طرح ہوسکتا تھا۔ضرور ہے کہ جماعت کے لوگوں کو یہ حکم دیا گیا ہو کہ جاؤ اور مظاہرہ کرو۔ پس یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم ایسے افعال سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ یہ صحیح نہیں۔کیا یہ ہمدردی نہیں کہ ہزاروں احمدی اس کے جنازہ میں شامل ہوئے اور کیا بغیر خاص حکم کے ایسا ہوسکتا تھا۔ پھر یہ بھی کہ کیوں جماعت نے ان کا جنازہ پڑھا اگر وہ اس فعل کو برا کہتے تھے تو ایسے شخص کا جنازہ کیوں پڑھا گیا۔

دوسری طرف یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اگر جنازہ پڑھنا بُرا نہیں تھا تو امام جماعت احمدیہ نے خود کیوں جنازہ نہیں پڑھایا گویا وہ اس اعتراض کی دوشقیں کرتے ہیں۔ایک تو یہ کہ اگر اس کا فعل بُرا تھا تو پھر جماعت کا اس کثرت کے ساتھ اس کے جنازہ میں شامل ہونا درست نہیں تھا۔ پھر یہ کہ ان کا شامل ہونا آپ ہی آپ نہیں تھا بلکہ مرکز کی طرف سے حکم تھا کہ جنازہ میں ضرور شامل ہونا چاہئے۔اس طرح ان کے نزدیک گویا منافقت کی گئی ہے کہ دنیا کو یہ کہا گیا ہے کہ ہم اس کے فعل سے بیزار ہیں مگر عملاً اس بیزاری کا اظہار نہیں کیا گیا۔دوسری شق اس اعتراض کی یہ ہے کہ اگر جنازہ پڑھنا کوئی بُرا کام نہیں تھا تو خود میں نے کیوں جنازہ نہیں پڑھایا۔

یہ وہ چار اعتراضات ہیں جو میرے کانوں میں پڑے ہیں۔اور میں سمجھتا ہوں ان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر دینا میرے لئے ضروری ہے تاکہ جس حد تک اعتراض ناواجب ہے اس کا ازالہ ہوجائے اور جس حد تک اعتراض حقیقت پر مبنی ہے اس کی تشریح ہوجائے۔

بیشتر اس کے کہ میں اصل سوالوں کا جواب دوں۔میں سمجھتا ہوں یہ مناسب ہوگا کہ دوستوں کو سمجھانے کے لئے اور مخالفوں کو سمجھانے کے لئے بھی (اگر وہ سمجھنے کی کوشش کریں) بعض اصول بیان کر دوں کیونکہ ان اصول کو سمجھے بغیر ان باتوں کے جوابات پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتے اور جو پہلو میں اختیار کروں گا وہ پوری طرح ان پر واضح نہیں ہوسکے گا۔

پہلا امر جو ان تشریحات کے سمجھنے سے پہلے جنہیں آئندہ چل کر اگر اللہ نے مجھے توفیق دی تو بیان کروں گا یہ ہے کہ الفاظ کی ظاہری شکل کو دیکھ کر کسی فتویٰ کا لگا دینا درست نہیں ہوتا بلکہ اس حقیقت کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ جو الفاظ کے پیچھے ہوتی ہے۔ دنیا میں ظاہری صورتیں

نہ کچھ حقیقت رکھتی ہیں اور نہ ظاہری فقرات کچھ حقیقت رکھتے ہیں۔ بسا اوقات اچھے فقرے ہوتے ہیں جن کے بُرے معنے ہوتے ہیں اور بسا اوقات بُرے فقرے ہوتے ہیں جن کے اچھے معنی ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں لوگ عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ فلاں بڑا حضرت ہے۔ اب ''بڑا حضرت'' کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ قابلِ عزت لوگوں میں سے وہ شخص بہت بڑا ہے۔ اور اگر ہم الفاظ کو لیں تو یہ تعریفی الفاظ ہیں بُرے الفاظ نہیں کہ فلاں صاحب بڑے حضرت ہیں کیونکہ حضرت کا لفظ ادب اور احترام کے لئے بولا جاتا ہے۔ حتّٰی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی جو لفظ کثرت سے ہمارے ملک میں استعمال کیا جاتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق بھی جو لفظ ہم کثرت سے استعمال کرتے ہیں وہ حضرت صاحب یا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام ہے۔ پھر ان سے اُتر کر اور بزرگوں کے متعلق بھی ہم حضرت کا لفظ استعمال کرتے ہیں چاہے وہ دینی بزرگ ہوں یا دنیوی۔ عام طور پر ہمارے ملک میں مؤدب اولاد کہتی ہے۔ حضرت والد صاحب کی طرف سے یہ بات ہے۔ اس زمانہ میں عربی زبان میں بھی والد کی نسبت یا اور بزرگوں کی نسبت حضرت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تو ہمارے ہاں جو تعریف کے الفاظ ہیں ان میں سے بہترین لفظ یہ ہے۔ علماء کا جب ذکر جب عربی کے اخبارات میں کریں گے تو کہیں گے، الحضرت الفاضل فلاں فلاں، باپ کا ذکر آئے تو کہیں گے الحضرۃ الوالد، پیروں کا ذکر ہمارے ملک میں جب ان کے مرید کرتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارے حضرت صاحب ایسے تھے، بزرگوں کا ذکر کرنا ہو تو کہتے ہیں، حضرت فلاں بڑے بزرگ ہوئے ہیں لیکن باوجود اتنا متبرک لفظ ہونے کے اور باوجود اتنی وسیع عظمت کے معنی اپنے اندر مخفی رکھنے کے ہمارے ملک میں طنزاً بعض دفعہ کہہ دیا جاتا ہے فلانے بڑے حضرت ہیں۔ یا فلاں بڑا حضرت ہے۔ اب کیا ان معانی کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی کہہ سکتا ہے کہ ''بڑے حضرت'' کا لفظ اس نے ادب کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تو ہر جگہ خالی الفاظ کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ حقیقت کو دیکھا جائے گا اور اس امر پر غور کیا جائے کہ ان الفاظ کو کس رنگ میں استعمال کیا گیا ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی عادت تھی کہ جب آپ بہت جوش اور محبت سے

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر کرتے تو ''مرزا'' کا لفظ استعمال کیا کرتے اور فرماتے ''ہمارے مرزا'' کی یہ بات ہے۔ ابتدائی ایام سے جبکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ابھی دعویٰ نہیں تھا چونکہ آپ کے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تعلقات تھے اس لئے اس وقت سے یہ الفاظ آپ کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ کئی نادان اس وقت اعتراض کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ادب نہیں۔ (حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں آپ کو لوگ عام طور پر مولوی صاحب، یا بڑے مولوی صاحب کہا کرتے تھے) میں نے خود کئی دفعہ یہ اعتراض لوگوں کے منہ سے سنا ہے اور حضرت مولوی صاحب کو اس کا جواب دیتے ہوئے بھی سنا ہے چنانچہ ایک دفعہ اسی مسجد میں حضرت خلیفہ اوّل جب کہ درس دے رہے تھے آپ نے فرمایا۔ بعض لوگ مجھ پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ادب نہیں کرتا حالانکہ میں محبت اور پیار کی شدت کے وقت یہ لفظ بولا کرتا ہوں۔ تو ظاہری الفاظ کو نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ ان الفاظ کے اندر جو حقیقت مخفی ہو اس کو دیکھنا چاہئے۔ جیسے میں نے بتایا ہے بعض الفاظ معمولی ہوتے ہیں مگر ان میں پیار کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے اور بعض الفاظ اچھے ہوتے ہیں مگر ان کا مضمون نہایت بُرا ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں عام طور پر جب کسی کو بیوقوف کہنا ہو تو اسے بادشاہ کہہ دیتے ہیں اور باتیں کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں ''بادشاہوا ے کی کہندے ہو'' یعنی تمہاری باتیں احمقوں کی سی ہیں۔

پس جب کسی کو بادشاہ کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ احمق ہے اور اگر اگلا بادشاہ کہنے سے چڑے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ میں نے اس کی اتنی تعریف کی اور یہ اُلٹا مجھ سے ناراض ہوتا ہے۔ تو خالی الفاظ نہیں دیکھے جاتے بلکہ ان الفاظ کا جو مفہوم ہوتا ہے وہ دیکھا جاتا ہے:-

پس ہمیشہ کسی امر کے متعلق فتویٰ لگانے سے پہلے اس حقیقت کو معلوم کرنا چاہئے جو پس پردہ کام کر رہی ہوتی ہے۔ ہر اعتراض اعتراض نہیں ہوتا اور ہر تعریف تعریف نہیں ہوتی۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ دوزخ میں جب وہ کافر روسا ڈالے جائیں گے جو دنیا میں بڑے بڑے دعوے

کیا کرتے تھے تو انہیں کہا جائے گا۔ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ[1] تُو عذاب کا مزہ چکھ۔ تُو تو بڑی شان والا اور معزز آدمی ہے۔ اب قرآن کریم میں جو یہ الفاظ آتے ہیں کہ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ اس کے معنے گو بڑی شان والے اور معزز کے ہیں مگر یہ حقیقت کے لحاظ سے استعمال نہیں کئے گئے بلکہ طعن کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔ یعنی تو دنیا میں سمجھا کرتا تھا کہ میں اتنا بڑا آدمی ہوں مجھے کوئی عذاب نہیں دے سکتا، میں ایسا معزز ہوں مجھے کوئی ذلّت نہیں پہنچ سکتی اب تُو دیکھ کہ تیری عزت اور شان کہاں گئی اور اگر تُو واقع میں شان والا اور معزز ہے تو آج تجھے یہ ذلت کیوں پہنچ رہی ہے گو الفاظ ایسے استعمال کئے گئے ہیں جن کے ظاہری معنے عزت اور شان کے ہیں۔

مثنوی رومی کا ایک واقعہ میں نے کئی دفعہ سنایا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ جنگل سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک گڈریا چٹان پر بیٹھا ہؤا ہے۔ پاس اس کی بکریاں چَر رہی ہیں اور وہ اپنی گڈری میں سے جُوئیں دیکھتا چلا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ اے اللہ! اگر تو مجھے مل جائے تو میں تیری جُوئیں دیکھوں، تیرے پیروں سے کانٹے نکالوں، تجھے بکریوں کا تازہ تازہ دودھ پلاؤں، تُو تھک جائے تو تجھے دباؤں اور تیری دن رات خدمت کرتا رہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سنا تو وہ بڑے ناراض ہوئے اور اسے جا کر ڈانٹا اور مارا اور کہا نالائق تجھے شرم نہیں آتی تو اللہ تعالیٰ کی بے ادبی کرتا ہے۔ وہ ڈر کے مارے وہاں سے بھاگا اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الہام نازل ہؤا کہ اے موسیٰ! تُو نے ہمارے بندے کو بڑا دُکھ دیا۔ اے موسیٰ! ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق بات کرتا ہے۔ جو الہامات سے تجھ پر صفاتِ الٰہیہ کا ظہور ہؤا ہے وہ اس گڈریا پر تو نہیں ہؤا۔ پس یہ جو کچھ کہہ رہا تھا محبت کے جوش میں کہہ رہا تھا۔ اس سے زیادہ تعریفی الفاظ اس کے نزدیک اور کوئی نہیں ہو سکتے اور اس کا پیار انہی الفاظ میں ظاہر ہو سکتا تھا کہ اے اللہ! میں تیری جُوئیں دیکھوں، میں تیرے کانٹے نکالوں، میں تجھے بکری کا تازہ تازہ دودھ پلاؤں، میں تیرے تلوے سہلاؤں، میں تیرے پاؤں دباؤں۔ یہی چیزیں اس کے نزدیک اہمیت رکھتی تھیں اور یہی وہ پیار کی ممتاز علامتیں سمجھتا تھا، تو جو کچھ اس کے پاس اپنی محبت کے اظہار کا

ذریعہ تھا اس سے اس نے کام لے لیا۔ پس اس کو مار پیٹ کر تُو نے اسے نہیں بلکہ ہمیں دکھ دیا ہے جا اور اس کو راضی کر۔

اب دیکھو بظاہر یہ کتنے بُرے لفظ ہیں۔ خدا تو الگ رہا ایک معمولی رئیس کے متعلق بھی اگر ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں اور کہا جائے کہ کاش میں تیری جُوئیں نکالا کروں۔ تو وہ کہنے والے پر سخت ناراض ہوگا۔ اور کہے گا کیا تُو چاہتا ہے میں عقل و ہوش بالکل کھو بیٹھوں اور اتنا گندہ ہو جاؤں کہ سر میں جوئیں پڑ جائیں اور پھر اس قدر عاجز اور لاچار ہو جاؤں کہ کسی دوسرے کو صفائی کرنی پڑے۔ لیکن خدا تعالیٰ کے حضور وہ الفاظ چونکہ ایک ایسے شخص کے تھے جس کی نیت صاف تھی اور وہ اپنے مَافِی الضمیر کو کسی اور رنگ میں ظاہر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا اس لئے وہ قبول ہو گئے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہی مطالبہ کیا جا سکتا تھا کہ جن بہترین الفاظ میں وہ محبت کا اظہار کر سکتا ہے ان الفاظ میں وہ خدا تعالیٰ کے متعلق محبت کا اظہار کر دے۔ سو اس نے اس مطالبہ کو پورا کر دیا۔ اس کے پاس محبت ظاہر کرنے کا یہی طریق تھا کہ پاؤں میں سے کانٹے نکالے، بکریوں کا دودھ پلائے۔ سر میں سے جُوئیں نکالے، پس اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہوئے اس نے یہی طریق اختیار کیا اور کہنا شروع کر دیا اے اللہ! اگر تُو مجھے مل جائے تو میں تجھے نہلاؤں، تیری گُدڑی صاف کروں، تیرے سر میں سے جوئیں نکالوں، تجھے تازہ تازہ دودھ پلاؤں اور تو سو جائے تو تیرے ہاتھ پاؤں دباؤں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کی مقدار کو نہیں دیکھتا بلکہ قلب کی حالت کو دیکھتا ہے اس لئے اس نے ان الفاظ کو قبول کر لیا۔ پھر بندوں کا کیا ذکر ہے ہم تو دیکھتے ہیں خدا تعالیٰ بھی ایسے الفاظ استعمال کر لیتا ہے اور قرآن کریم اس قسم کے الفاظ سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا ذکر آجاتا ہے، کہیں اس کی آنکھوں کا ذکر آجاتا ہے، کہیں اس کی پنڈلیوں کا ذکر آجاتا ہے اور حدیثوں میں تو خدا تعالیٰ کے بہت سے اعضاء کا ذکر آتا ہے۔ اب ان الفاظ کے یہ معنے نہیں کہ خدا تعالیٰ بھی نَعُوْذُ بِاللّٰہِ انسان کی طرح ہے یا اس کی بھی گردن ہے، چہرہ ہے، ناک ہے، منہ ہے، کان ہیں، دانت ہیں، زبان ہے، حلق ہے، سینہ ہے، دل ہے، پھیپھڑے ہیں، گردے ہیں، جگر، تلی معدہ انتڑیاں ہیں۔ یہ مراد ہرگز نہیں بلکہ چونکہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کو سمجھ نہیں سکتا اس لئے بندوں کو

سمجھانے کے لئے خدا تعالیٰ نے وہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ بھی بندے کی حالت دیکھ کر اس بات کو جائز سمجھتا ہے کہ اپنی صفات کو محدود شکل میں پیش کرے تو اگر اس کا کوئی نادان بندہ اپنی ناواقفیت کی وجہ سے ان الفاظ میں اپنی محبت کا اظہار کر دے تو یہ قابلِ اعتراض بات نہیں ہوگی جب تک وہ عقیدے اور حقیقت کے طور پر بیان نہ کرے۔ ہاں اگر وہ حقیقت کے طور پر بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ واقعہ میں اللہ تعالیٰ نَعُوذُ بِاللّٰہِ ایک غلیظ ہستی ہے، اس کے بڑے بڑے بال ہیں اور چونکہ اسے پانی نہیں ملتا اس لئے بالوں میں جوئیں پڑ جاتی ہیں اور ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی گڈریا اس پر مہربان ہو جو اسے نہلائے اور اس کی جوئیں نکالے، تو یہ واقع میں بری بات ہوگی۔ یا اگر عقیدے کے طور پر کوئی شخص بیان کر دے کہ اللہ تعالیٰ نَعُوذُ بِاللّٰہِ کنگال ہے، وہ سارا دن سفر کرتا رہتا ہے، اس کے پاؤں میں جوتی تک نہیں ہوتی اور کانٹے اس کے پیر میں چُبھ جاتے ہیں اور اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی گڈریا اس کے کانٹے نکالے تو یہ سخت معیوب بات ہوگی جیسے یہ معیوب بات ہے جو بعض مذاہب والوں کی طرف سے کہی جاتی ہے کہ خدا بندہ بن کر نازل ہوتا ہے چنانچہ بعضوں نے کہہ دیا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل میں ظاہر ہؤا۔ اور بعضوں نے کہہ دیا کہ وہ حضرت کرشن یا حضرت رام چندر جی کی شکل میں ظاہر ہؤا۔ آخر کیا فرق ہے اس بات میں کہ ہمارے اعلیٰ درجہ کے صوفی اس گڈریا کی براءت تو کرتے ہیں مگر ان لوگوں کی تردید کرتے ہیں جن کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی شکل میں حلول اختیار کرتا ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ گڈریا نے بھی یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہیں، اس کے پیر ہیں اس کا جسم ہے اور بعض مذاہب والے بھی یہی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض انسانوں کی شکل میں تجسّم اختیار کرتا ہے مگر تم ایک کے متعلق تو یہ کہتے ہو کہ وہ گمراہ ہیں اور ایک کے متعلق یہ کہتے ہو کہ اس نے محبت کے جوش میں ایسا کہا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ گڈریا خدا تعالیٰ کو واقع میں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ مگر وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے تجسم کے قائل ہیں، ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی جسم اختیار کرتا ہے۔ پس چونکہ وہ واقع میں سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں عام انسانوں کی طرح پیدا ہوتا ہے، پھر بڑا ہوتا ہے، پھر شادی بیاہ کرتا ہے، پھر اس کے بچے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے وہ گنہگار ہوتے ہیں، مگر

جو نا واقفیت کی وجہ سے اس رنگ میں اظہار محبت کرتا ہے وہ گنہگار نہیں ہوتا۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں بعض دفعہ مائیں اپنے بچوں سے ایسا سلوک کرتی ہیں جس کا ظاہر اور ہوتا ہے اور باطن اور۔ اگر کسی کو اپنا ماحول غور سے دیکھنے کا موقع ملا ہو تو اسے کئی ایسی مثالیں نظر آئیں گی کہ بعض دفعہ وہ غریب عورتیں جو امیر گھرانوں میں نوکر ہوتی ہیں یا وہ غریب عورتیں جن کے اردگرد امیر لوگ ہی بستے ہیں ان کا کوئی بچہ بعض دفعہ مظلومیت کے طور پر کسی امیر آدمی کے بچہ سے پِٹ جاتا ہے، وہ بعض دفعہ تکبر کی وجہ سے، بعض دفعہ شرارت کی وجہ سے اور بعض دفعہ یونہی بِلا وجہ دوسرے غریب بچہ کو پیٹ ڈالتا ہے، ماں یہ تمام واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میرا بچہ مظلوم ہے، وہ جانتی ہے کہ میرے بچے کا کوئی قصور نہیں، مگر وہ یہ بھی جانتی ہے کہ میں بدلہ نہیں لے سکتی۔ پس وہ اپنے غصہ کا اظہار اس طرح کرتی ہے کہ اپنے ہی بچہ کو پیٹنے لگ جاتی ہے۔ وہ اسے مارتی جاتی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں اور کہتی جاتی ہے کہ تو وہاں گیا کیوں تھا۔ تو وہاں گیا کیوں تھا۔ اب گو بظاہر بچے کو مار پڑ رہی ہوتی ہے مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ مار نفرت یا غصے کے اظہار کی علامت نہیں بلکہ محبت کے اظہار کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی طاقتور ماں ہو تو وہ مارنے والے بچہ کی ماں سے جا کر لڑ سکتی ہے۔ اگر کوئی برابر کا خاندان ہو تو اس کا مقابلہ کر سکتا ہے مگر وہ ماں جو سمجھتی ہے کہ میرے اندر مقابلہ کی طاقت نہیں اور ادھر اس کا دل چاہتا ہے کہ میں پیٹ کر اپنا غصہ نکالوں۔ جب وہ اپنے غصہ کے اظہار کا اور کوئی ذریعہ نہیں دیکھتی تو اپنے ہی بچہ کو مارنے لگ جاتی ہے اور کہتی ہے تُو وہاں گیا کیوں تھا حالانکہ وہ بچہ کو حق پر سمجھتی ہے۔ تو عقل بتاتی ہے کہ اس کی مار اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ تُو وہاں کیوں گیا تھا بلکہ اس کی مار اس وجہ سے ہوتی ہے کہ تُو نے ایسے مقام پر مجھے کیوں کھڑا کیا کہ میں تیری کوئی ہمدردی نہیں کر سکتی۔ دنیا میں ماریں غصہ پیدا کرتی ہیں اور بہت سی ماریں دیکھ کر تمہارے دل میں طیش پیدا ہوگا اور تم چاہو گے کہ اگر تمہارا بس چلے تو تم مارنے والے کو مارو اور اسے سرزنش کرو لیکن اگر تمہاری عقل کی آنکھیں کُھلی ہیں اور اگر روحانیت کی کوئی حِسّ تم میں باقی ہے تو ایسی عورت کو مارتے دیکھ کر تمہاری آنکھوں میں آنسو آجائیں گے اور تم عورت پر غصّے نہیں ہو گے بلکہ اپنے خدا سے کہو گے کہ اے خدا! کیا دنیا میں تیری ایسی بے بس مخلوق بھی موجود ہے

جوظلم کا جواب کسی رنگ میں بھی نہیں دے سکتی اور آخر اپنے آپ کو ہی پیٹ ڈالتی ہے اب وہ مار پیٹ درحقیقت مار پیٹ نہیں ہوگی بلکہ دُھواں ہوگا ماں کے دل کا وہ غبار ہوگا اس کی بے بسی کا۔ تم اس کی ظاہری شکل پر فتویٰ نہیں لگا دو گے بلکہ تم اس کے اندرونی احساسات اور جذبات کو دیکھو گے۔ اسی طرح جہاں تک میں سمجھتا ہوں پشاور کے جس دوست کے متعلق یہ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں ان کی حالت بھی ایسی ہی ہے۔ ان کے دل میں بھی ایک جوش پیدا ہوا اور انہوں نے دیکھا کہ اب یہ جوش کسی طرح نکل نہیں سکتا تو جس طرح ماں بعض دفعہ اپنے مظلوم بچے کو پیٹنے لگ جاتی ہے اسی طرح وہ بھی اپنے آدمیوں کو بُرا بھلا کہنے لگ گئے۔ یہ چیز ظاہر میں بُری ہوگی جیسے مار پیٹ ظاہر میں بُری چیز ہے۔ جیسے یہ امثال بہرحال بُری ہیں کہ میں خدا کے پیر سے کانٹے نکالوں، اس کے ہاتھ اور پاؤں دباؤں لیکن کہنے والا بُرا نہیں کیونکہ اسے اپنی محبت کے جوش میں کوئی اور ذریعہ سوائے اس کے نہیں ملا۔ بہرحال فعل کا صدور محبت کے نتیجہ میں ہوا ہے کسی بُرائی کے نتیجہ میں نہیں ہوا۔ میرے نزدیک پشاور کے جس دوست کی باتوں پر اعتراض کیا گیا ہے، اُن کا اظہارِ خیال بھی اسی قسم کا ہے۔ یعنی اپنے دل کی تکلیف کو انہوں نے غلط الفاظ میں ادا کر دیا ہے۔ ورنہ واقعہ بتاتا ہے کہ اعتراض ان کے مدنظر نہیں تھا صرف ان کے دل کے دکھ نے کوئی رستہ نکلنے کا نہ دیکھ کر بظاہر معترضانہ شکل اختیار کر لی ہے۔ جیسے ماں بعض دفعہ اپنے بچے کو ہی پیٹنے لگ جاتی ہے۔ خواہ وہ کسی سے مظلومانہ طور پر مار کھا کر آئے۔ اسی طرح انہوں نے بھی محبت کے رنگ میں قادیان کے لوگوں کو دو چار صلواتیں سنا دیں۔

پھر میرے نزدیک جس دوست نے شکایت کی ہے اس دوست نے بھی کوئی بُرا کام نہیں کیا اس لئے کہ اس نے اپنے نقطہ نگاہ سے اس کو دیکھا۔ جن جذبات سے معترض پُر تھا ان جذبات سے رپورٹ کرنے والا پُر نہیں تھا۔ اُس کی کیفیت بالکل اور قسم کی تھی اور اِس کی کیفیت بالکل اور قسم کی۔ ان میں سے ایک محبت کے مقام پر کھڑا تھا اور دوسرا ادب کے مقام پر اور یہ دونوں مقام اپنی اپنی جگہ اچھے ہیں لیکن بعض دفعہ یہ دونوں مقام ایک دوسرے کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یوں اسلام نے یہ دونوں مقام جمع کئے ہیں اور فرمایا ہے کہ کامل ایمان اسی شخص کا ہے جس میں محبت اور ادب دونوں جمع ہوں لیکن دنیا میں عام طور پر کبھی محبت کا پہلو غالب آجاتا ہے اور

کبھی ادب کا پہلو غالب آ جاتا ہے۔ جب محبت کا پہلو غالب ہوتو وہ ادب کے سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور جب ادب کا پہلو غالب ہوتو وہ محبت کے سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ ہم روزانہ دیکھتے ہیں ایک ہی قسم کے واقعات سے ایک کچھ نتیجہ نکالتا ہے اور دوسرا کچھ۔ جلسہ سالانہ کے ایام میں میں نے دیکھا ہے بعض لوگ آنے والوں کے متعلق یہ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ وہ کیسے ہیں۔ یہاں آتے ہیں اور خلیفۃ المسیح سے مصافحہ کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے۔ معلوم ہوتا ہے ان کے دل میں محبت کا کوئی جذبہ نہیں اور دوسرا شخص یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ رات دن ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں اور پھر بھی بعض لوگ حضرت خلیفۃ المسیح کو چلنے نہیں دیتے دھکے پہ دھکا مارتے ہیں اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ غصے سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بھی سچا ہوتا ہے اور یہ بھی سچا ہوتا ہے مگر ان میں سے ایک ادب کے مقام پر کھڑا ہوتا ہے اور وہ محبت کے مقام کو نہیں سمجھ سکتا۔ اور دوسرا محبت کے مقام پر کھڑا ہوتا ہے اور وہ ادب کے مقام کو نہیں سمجھ سکتا۔ پس میں دونوں کو مخلص سمجھتا ہوں۔ درحقیقت واقعات کی کڑی کسی کے اخلاص میں فرق لاتی ہے۔ مثلاً اگر ہم ایک شخص کو دیکھیں کہ اس نے کوئی بُرائی بیان کی ہے تو ہم اسی وقت یہ فیصلہ نہیں کرسکیں گے کہ اس نے محبت کے جذبہ کی وجہ سے یہ برائی بیان کی ہے۔ یا دل کے زنگ کی وجہ سے یہ برائی بیان کی ہے۔ لیکن اگر ہم دیکھیں کہ ایک شخص ہمیشہ بُرائیاں بیان کرتا رہتا ہے یا ہمیشہ جماعتی کاموں سے الگ رہتا ہے۔ تب ہم بے شک کہہ سکیں گے کہ اس کے دل پر زنگ لگ چکا ہے اور اس کے اخلاص میں کمی آ گئی ہے۔ پس اگر واقعات کا تسلسل اور ایک لمبی زنجیر بتا دے کہ فلاں شخص مجرم ہے تب ہم اسے مجرم سمجھیں گے ورنہ محض ایک بات سن کر ہم کسی کے اخلاص سے انکار نہیں کر سکتے

دوسری بات جو میں بتانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ واقعات سے موجبات کو دریافت کرنا کوئی محفوظ طریق نہیں ہوتا۔ ہم ایک واقعہ دیکھتے ہیں اور بغیر اس کے کہ اصل سبب ہمیں معلوم ہو ہم اس کا ایک سبب فرض کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب ہمارے لئے یہ جائز ہوگیا ہے کہ ہم وہ سبب ہر جگہ بیان کرتے پھریں حالانکہ ایک قسم کا نتیجہ ہمیشہ ایک ہی سبب کے نتیجہ میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایک ہی قسم کے نتیجہ کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ پیٹ درد ایک مرض ہے جو بِالعموم

لوگوں کو ہوتا رہتا ہے مگر ہر پیٹ درد ایک ہی کھانے سے نہیں ہوتا بلکہ بیسیوں کھانے ایسے ہیں جن کے کھانے سے پیٹ درد ہو جاتا ہے۔ پھر بیسیوں دردیں ایسی بھی ہیں جو کھانے سے تعلق ہی نہیں رکھتیں۔ کسی کو چوٹ لگ جائے تو اس سے بھی پیٹ درد ہو جائے گا۔ معدہ کے اعصاب میں حدت اور تیزی پیدا ہو جائے تو اس سے بھی پیٹ درد ہو جائے گا۔ تیزابی مادہ معدہ میں بڑھ جائے تو اس سے بھی پیٹ درد ہو جائے گا۔ خلوّ معدہ سے بھی پیٹ درد ہو جاتا ہے اسی طرح اور بیسیوں اسباب ہیں جن کے نتیجہ میں پیٹ درد پیدا ہو جاتا ہے۔ اب اگر کوئی سمجھے کہ پیٹ درد محض ثقیل غذاء کھانے سے ہوتا ہے اور جب کسی کے متعلق یہ سنے کہ اسے پیٹ درد ہے تو یہ کہنا شروع کر دے کہ ضرور اس نے ثقیل غذاء کھائی ہوگی، تو یہ نادانی ہوگی۔ اسی طرح ہیضہ زیادہ کھانا کھانے سے بھی ہو جاتا ہے اور ہیضہ خالی معدہ رہنے سے بھی ہو جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ ہیضہ پڑا۔ ایک شخص ہیضہ میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ جب اس کی نعش آئی اور جنازہ پڑھا جانے لگا تو ایک شخص بغیر اس بات کا خیال کئے کہ اس کے رشتہ داروں کو تکلیف ہوگی صفوں میں ادھر ادھر دوڑتا پھرے اور شور مچاتا پھرے کہ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ لوگوں کی عقل کو کیا ہو گیا۔ بس وہ کھانے بیٹھتے ہیں تو غذا ٹھونستے چلے جاتے ہیں اور اس بات کا کوئی خیال نہیں کرتے کہ زیادہ کھا لیا تو ہیضہ ہو جائے گا بس اُٹھتے بیٹھے سوتے جاگتے کھانے کا فکر رہتا ہے اور پھر اتنا کھائیں گے کہ حلق تک غذاء ٹھونس لیں گے کوئی یہ خیال نہیں کرتا کہ اپنی صحت کا بھی خیال رکھا جائے۔ ہم تو ہمیشہ ایک پھُلکا کھاتے ہیں۔ ہم تو ہمیشہ ایک پھُلکا کھاتے ہیں۔ ہمیں ہیضہ کیوں نہیں ہوتا۔ بس وہ اِدھر اُدھر دَوڑتا پھرے اور بار بار یہ الفاظ کہتا جائے۔ دوسرے دن پھر ایک جنازہ آیا کسی نے پوچھا کہ کس کا جنازہ ہے؟ کوئی دل جَلا پاس کھڑا تھا وہ کہنے لگا یہ اُسی ایک پھُلکا کھانے والے کا جنازہ ہے۔ بات یہ ہوئی کہ دوسرے ہی دن اِس ایک پھُلکے کا شور مچانے والے کو بھی ہیضہ ہو گیا اور وہ فوت ہو گیا۔ تو ہر چیز کا سبب ایک نہیں ہوتا بلکہ مختلف اسباب ہوتے ہیں کیونکہ ایک نتیجہ کئی موجبات سے نکل سکتا ہے۔

تناسخ کے بارہ میں ہندوؤں نے یہی دھوکا کھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی امیر ہے

کوئی غریب، کوئی کمزور ہے کوئی طاقتور، کوئی سفید ہے کوئی کالا، کوئی بیمار ہے کوئی تندرست، کوئی موٹا ہے کوئی دُبلا، کوئی اندھا ہے کوئی سُوجاکھا، اب یہ جو مختلف قسم کے تغیرات دنیا میں پائے جاتے ہیں ان کا کوئی سبب ہونا چاہئے۔ پھر وہ خود ہی ایک سبب نکال لیتے ہیں اور کہتے ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان میں اتنا عظیم الشان فرق نہیں کرسکتا تھا اس لئے ضرور ہے کہ پہلے جنم کے اچھے یا بُرے اعمال کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرق کیا ہو۔ اس طرح انہوں نے خود بخود ایک سبب تجویز کر کے تناسخ کا عقیدہ گھڑ لیا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ انسانوں میں فرق ہونے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ کسی ایک عقلی سبب کو اصل سبب قرار دینا صداقت سے محروم ہونا ہے۔ کسی نتیجہ کا اصل سبب کیا ہے اس کا علم واقعہ سے ہی لگ سکتا ہے نہ کہ قیاس سے اگر کوئی قیاس کرے گا تو وہ ضرور ٹھوکر کھائے گا۔ میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ ہندوؤں کے اس اصل کی ایسی ہی مثال ہے جیسے رات کے وقت کوئی شخص بازار میں سے گزر رہا ہو۔ اب یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا کوئی رشتہ دار بیمار ہو اور اس نے اسے کہلا بھیجا ہو کہ مجھے آکر مل جاؤ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ریل کا وقت ہو اور ریلوے سٹیشن کا راستہ وہیں سے گزرتا ہو اور وہ گاڑی میں سوار ہونے کے لئے وہاں سے گزر رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کوئی مسافر ہو جو کہیں دور سے آرہا ہو مگر راستہ میں اسے دیر ہو گئی ہو اور وہ اب گھر پہنچنے کے لئے جلدی جلدی جا رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کوئی چور ہو اور چوری کی نیت سے اس وقت پھر رہا ہو۔ اب اگر ہم اس کو دیکھ کر ان تمام قیاسات میں سے ایک قیاس کرلیں کہ وہ ضرور چور ہے اور اس قیاس کی بناء پر بلا تحقیق کے اسے چوری کی سزا دے دیں تو سخت ظلم ہوگا۔ یہی حال ہندوؤں کا ہے۔ انہوں نے بھی فیصلہ کرلیا کہ چونکہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں میں فرق نہیں کرسکتا اس لئے ضرور ہے کہ پہلے کسی جنم میں انسان اچھے یا برے اعمال کر چکا ہو اور ان کی سزا یا جزاء بھُگتنے کے لئے اِس عالَم میں آیا ہو۔ یہ نہیں دیکھا کہ بنی نوع انسان میں جو تفاوت پایا جاتا ہے اس کے اور بھی کئی موجبات ہو سکتے ہیں۔ صرف عقل سے ایک سبب معلوم کیا اور اسی کو اصل سبب قرار دے کر اس پر عقیدہ کی بنیاد رکھ دی۔ یہی ٹھوکر عیسائیوں نے کھائی ہے۔ انہوں نے بھی یہ خیال کرلیا کہ خدا تعالیٰ عادل ہے وہ کسی کو بغیر گناہ کے تکلیف نہیں دے سکتا اور مسیح بے گناہ تھے ان کو جو تکلیف پہنچی وہ ضرور کسی گناہ کے سبب سے

ہونی چاہئے مگر چونکہ وہ گنہگار نہ تھے اس لئے معلوم ہوًا انہوں نے اپنے ماننے والوں کے گناہ اپنے سر پر اُٹھالئے اور ان پر ایمان لانے والوں کے گناہ اس طرح معاف ہوگئے۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ بے شک تکلیف گناہ کے نتیجہ میں بھی آتی ہے لیکن ہر تکلیف گناہ کے نتیجہ میں نہیں آتی۔ بعض تکالیف قوانینِ طبیعت کی خلاف ورزی سے آتی ہیں، بعض قوانین طبیعت کے مخالف اجتماع سے آتی ہیں، بعض تکالیف محض ایک تکلیف پانے والے کے قرب میں بیٹھے ہونے کے سبب آتی ہیں، بعض تکالیف انسان کے اعلیٰ اندرونی قویٰ کو ظاہر کرنے کے لئے اور اس شخص کی قیمت لوگوں پر ثابت کرنے کے لئے آتی ہیں، بعض تکالیف اس لئے آتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں دور کر کے اپنی قدرت کو ظاہر کرے۔ غرض تکالیف کا فلسفہ ایک وسیع فلسفہ ہے اور سب تکالیف ایک ہی سبب کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتیں مگر مسیحیوں نے ان تمام اسباب کو نظر انداز کر کے ایک ہی سبب قیاس کر کے اس پر اپنے عقیدہ کی بنیاد رکھ دی اور حضرت مسیح ناصری کے صلیبی واقعہ کو اُمتیوں کے گناہوں کی سزا قرار دے دیا۔ تو دوست بھی ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں لیکن عام طور پر دشمن بوجہ دشمنی کے اور بوجہ اس کے کہ تعصب کی پٹی ان کی آنکھوں پر بندھی ہوتی ہے ایک سبب جو بُرا ہوتا ہے لے لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ فلاں فعل کا یہی سبب ہوگا۔ یہ خیال نہیں کرتے کہ ممکن ہے کہ اس کا کوئی اور سبب ہو۔ جس کی وجہ سے وہ فعل جس پر وہ معترض ہیں برا نہ رہے۔ مجھے اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ میں دیکھتا ہوں ہمارے دوستوں میں سے بھی کئی ایسے ہیں جو واقعات کو دیکھ کر قیاس کر لیتے ہیں اور کہنے لگ جاتے ہیں کہ اس کا سبب ضرور فلاں امر ہے حالانکہ ایسے موقع پر انسان کا قیاس سے نتیجہ نکالنا بسا اوقات اسے گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ [2] گمان سے اور خیالی باتوں سے بچ کیونکہ خیال تجھ کو اکثر جھوٹ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ تو واقعات کے بارہ میں اربعہ لگا کر نتیجہ نکالنا بڑا خطرناک راستہ ہے اور اکثر دفعہ گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ گو کبھی درست نتیجہ بھی نکل آتا ہو مگر چونکہ طریقہ غلط ہے، نتیجہ درست بھی ہو تو بھی انسان بدظنی کے گناہ کا مرتکب قرار دیا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی کتاب میں مجرم لکھا جاتا ہے۔ ہمیں قیاس اُسی حد تک کرنا چاہئے جس حد تک

بات ہے۔اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔اسلام کے جو محقق فقہاء گزرے ہیں، انہوں نے تو اس مسئلہ پر اتنا زور دیا ہے کہ اسے کمال تک پہنچا دیا ہے۔مثلاً ان میں اس بات پر بحثیں ہوئی ہیں کہ اگر شریعت نے کسی بات کے متعلق قسم رکھی ہو اور دوسرا شخص قسم نہیں کھاتا مگر جس کے مقابلہ میں وہ کھڑا ہے وہ قسم کھالیتا ہے تو اس کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائیگا۔محققین فقہاء نے کہا ہے کہ دوسرے شخص کو اس وجہ سے کہ اس نے قسم نہیں کھائی ہم مجرم قرار نہیں دیں گے بلکہ اسے اس وقت تک بند رکھیں گے جب تک وہ قسم نہیں کھاتا یا اقرار نہیں کرتا۔اگر وہ نہ قسم کھائے اور نہ اقرار کرے تو اسے قید تو رکھیں گے مگر اس جرم کی شرعی سزا کا مستوجب اسے قرار نہیں دیں گے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اس کے قسم نہ کھانے سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں اصل واقعہ کا پتا نہیں لگا۔یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پتہ لگ گیا ہے۔مثلاً میاں بیوی میں ملاعنہ کی صورت ہے۔قرآن کریم میں آتا ہے کہ اگر خاوند اپنی بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے یا بیوی خاوند پر الزام لگائے اور ان کے پاس سوائے اپنی عینی شہادت کے اور کوئی گواہ موجود نہ ہوں تو پھر میاں بیوی کے درمیان ملاعنہ ہوگا اور چار چار گواہوں کی جگہ اُن سے چار چار دفعہ قسمیں لی جائیں گی۔[۳] اب اگر مرد قسم کھا جائے مگر عورت نہ کھائے تو فقہاء نے بحث کی ہے کہ اس صورت میں کیا کیا جائے۔بعضوں نے کہا ہے کہ جس نے قسم نہیں کھائی ہم اسے مجرم سمجھیں گے۔مگر بُہتوں نے کہا ہے کہ ہم اسے مجرم نہیں سمجھیں گے بلکہ اس وقت تک اسے قید رکھیں گے جب تک وہ قسم نہ کھائے یا اقرار نہ کرے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اس فعل سے شُبہ پیدا ہوتا ہے، جُرم ثابت نہیں ہوتا۔تو قیاس سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کیونکہ ممکنات کئی ہوتے ہیں۔بعض دفعہ ضد میں آکر انسان کہہ دیتا ہے کہ میں قسم نہیں کھاؤں گا اور بعض دفعہ کسی اور وجہ سے قسم نہیں کھاتا۔پس وہ کہتے ہیں کہ ایسی حالت میں ہم اسے صرف قید رکھیں گے۔کسی نے کہا کہ قید کیوں کرو گے۔تو انہوں نے جواب دیا کہ اس لئے کہ شریعت کہتی ہے قسم کھاؤ اور چونکہ اس نے قسم نہیں کھائی اس لئے ہم اسے شریعت کی نافرمانی کا مجرم تو قرار دے سکتے ہیں مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ قسم نہ کھانے کی وجہ سے وہ جرم ثابت ہوگیا ہے جس کے فیصلہ کرنے کے لئے قسم رکھی گئی تھی۔

ہمارے دشمنوں نے بھی صرف یہ دیکھ کر کہ میاں عزیز احمد صاحب جو ایک غریب آدمی تھے

ان کے مقدمہ کی ہائی کورٹ میں اپیل ہوئی اور شیخ بشیر احمد صاحب پیش ہوئے اور پھر پریوی کونسل میں اپیل ہوئی، یہ قیاس کر لیا کہ جماعت جھوٹ بولتی ہے اور ضرور اندرونی طور پر ہزاروں روپیہ انہوں نے خرچ کیا ہے بلکہ دشمن تو دشمن رہے ہمارے جماعت کے بعض منافقین نے بھی جن کے متعلق ہمارے پاس رپورٹیں پہنچ چکی ہیں مگر ابھی میں نے ان کے اخراج کا اعلان نہیں کیا اپنی مجلسوں میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہزاروں روپیہ ان مقدمات پر جماعت نے خرچ کیا ہے حالانکہ جیسا کہ اعتراض کے جواب میں مَیں بتاؤں گا ان کا یہ تخمینہ بالکل غلط ہے۔ انہوں نے فرض کر لیا کہ جماعت کی مدد کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا تھا اور پھر خود بخود یہ نتیجہ نکال لیا کہ ضرور جماعت نے اس کی مدد کی ہے حالانکہ واقعہ بالکل اور ہے۔ اس وقت میں جماعت کو اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی غلطیوں کے نتائج نہایت ہیبت ناک ہوتے ہیں۔ تم واقعات کو دیکھ کر اس امر کے مجاز نہیں کہ کہہ سکو اس واقعہ کا فلاں سبب ہے۔ کیونکہ ایک واقعہ کے کئی موجبات ہو سکتے ہیں۔ پھر جس واقعہ کے ثبوت کے لئے گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح کسی واقعہ کا موجب بیان کرنا بھی اُس وقت تک ہمارے لئے جائز نہیں ہو سکتا جب تک اس موجب کا ثبوت ہمارے پاس مہیا نہ ہو۔

تیسرا اصل یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انسانی افعال کا اثر جو دلوں پر پڑتا ہے وہ صرف ان کے اچھے یا بُرے ہونے کی نسبت سے نہیں پڑتا بلکہ قلوب کا انفعال بعض اور متعلقہ واقعات کو مدنظر رکھ کر پیدا ہوتا ہے یعنی کسی کی چوری دیکھ کر یا اس کا ذکر دوسرے کی زبان سے سُن کر یا قتل ہوتے دیکھ کر یا اس کا ذکر دوسرے کی زبان سے سُن کر یا کسی کو غیبت کرتے دیکھ کر یا اس کا ذکر دوسرے کی زبان سے سن کر ہمارے دل پر جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ فعل کی برائی کی نسبت سے نہیں ہوتا بلکہ قلوب میں جو اثرات پیدا ہوتے ہیں وہ اور بہت سے امور متعلقہ کے مجموعی اثر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ بسا اوقات ایک بڑی چوری ہوگی مگر جب تم اس کا ذکر سنو گے تمہارے دل پر زیادہ برا اثر نہیں پڑے گا۔ اور بسا اوقات ایک چھوٹی سی چوری ہوگی۔ مگر جب تم اسے سنو گے تو تمہارا دل اس کی بُرائی کو بہت زیادہ محسوس کرے گا کیونکہ گو پہلی چوری بڑی تھی مگر متعلقہ امور نے اسے بڑا نہیں بنایا اور گو دوسری چوری بڑی نہیں مگر متعلقہ امور نے اسے بھیانک بنا دیا ہے۔ تو تمام افعال

خواہ اچھے ہوں یا برے، بدیاں ہوں یا نیکیاں، انسانی قلب پر جو اثر پیدا کرتے ہیں وہ ظاہری حالات کے مطابق نہیں کرتے بلکہ اور بہت سے متعلقہ امور ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انسان ان سے زیادہ یا کم متاثر ہوتا ہے۔قدیم عربی زبان میں اسے انفعال یا تأثر کہتے ہیں۔گویا ہر فعل کے مقابلہ میں ایک حرکت ہمارے دل اور دماغ میں پیدا ہوتی ہے۔نئی عربی میں اسے ردالعمل انگریزی میں ری ایکشن اور اُردو میں بھی جدید عربی کی نقل میں ردّعمل کہتے ہیں اور یہ ردعمل ہر فعل کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔تم اگر کسی جگہ کھڑے ہو اور تمہارا کوئی دوست تمہارے پیٹ کی طرف یک دم اپنی انگلی زور سے لے آئے تو باوجود یہ جاننے کہ وہ تمہارا دوست ہے اور باوجود یہ جاننے کے کہ اس کے ہاتھ میں چاقو نہیں، تمہارا پیٹ کچھ پیچھے کو کھنچ جائے گا اور یہ جواب ہوگا کہ جو طبعی طور پر تمہارا پیٹ دے گا۔اسی طرح جب تم کسی کے منہ سے کوئی بات سنو گے تو اس کے مقابلہ میں تمہارے دل میں ایک اثر پیدا ہوگا۔بعض دفعہ وہ اثر اچھا ہوگا اور بعض دفعہ بُرا۔اگر بُرا اثر ہے تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ تم اسے ہر صورت میں بُرا سمجھتے ہو یا بعض صورتوں میں اور اگر اچھا اثر ہے تو پھر بھی یہ دیکھا جائے گا کہ تم اسے ہر صورت میں اچھا سمجھتے ہو یا بعض صورتوں میں اسی طرح اگر تم کسی فعل کو برا سمجھتے ہو تو یہ دیکھا جائے گا۔کہ اس کے نتیجہ میں تمہارے دل میں غصہ پیدا ہوتا ہے یا نفرت پیدا ہوتی ہے یا رحم پیدا ہوتا ہے اور اگر تم کسی فعل کو اچھا سمجھتے ہو تو باوجود اچھا سمجھنے کے تمہارے دل میں محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں یا نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔یہ ردعمل کی مختلف حالتیں ہیں جو انسانی قلب میں پیدا ہوتی ہیں۔کبھی کوئی حالت ہوگی اور کبھی کوئی۔یہ نہیں ہوگا کہ ہمیشہ ایک اثر پیدا ہو بلکہ مختلف برے اعمال کے نتیجہ میں مختلف اثرات پیدا ہوں گے۔مثلاً ایک شخص بھوکا مر رہا تھا اس نے کسی دوسرے شخص کی روٹی اٹھا کر کھالی۔اب یہ چوری ہے جو اُس نے کی اور اُس کا یہ فعل بہر حال بُرا ہے مگر اس چوری کا ذکر سن کر تمہارے دل میں صرف غصہ نہیں بلکہ رحم بھی پیدا ہوگا کیونکہ اس کا محرک ایک مجبوری تھی۔یعنی چونکہ وہ بہت تنگ حال تھا اس لئے مجبور ہو کر اس نے دوسرے کی روٹی کھالی۔پس جو خارج میں افعال پیدا ہوتے ہیں۔ان کا جو جواب دل میں پیدا ہوتا ہے وہ مفرد نہیں بلکہ مرکّب ہوتا ہے اور بہت سی وجوہات سے مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

کبھی ایک اچھے کام کے مقابلہ میں بھی دل میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے دوسرے سے دس روپے لینے ہیں یہ اس کا حق ہے اور وہ اس کا ہر وقت تقاضا کر سکتا ہے لیکن فرض کرو جس شخص سے اس نے دس روپے لینے ہیں وہ سخت تنگدست ہے۔ اس کے پاس صرف پانچ سات مرغیاں ہیں جن کے انڈے بیچ بیچ کر وہ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے۔ اب اگر یہ جا کر اس کی مرغیاں اٹھا لیتا اس کے انڈوں پر قبضہ کر لیتا اور اس کے گھر کی ایک دو اور چیزیں بھی ان روپوں کے بدلہ میں لے لیتا ہے اور قانون کی مدد سے قرق کرا کے لیتا ہے تو کوئی قانون اسے مجرم قرار نہیں دے گا اور تم بھی اس کے اس فعل کو بُرا نہیں کہو گے کیونکہ اس نے اپنا ایک حق حاصل کیا مگر یہ فعل دیکھ کر تمہارے دل میں محبت نہیں نفرت پیدا ہوگی۔ جب ایک بھوکے شخص نے دوسرے کی روٹی چرا لی تھی تو گو تم اس فعل کو برا کہہ سکتے تھے مگر اس مجرم کے متعلق رحم بھی پیدا ہوتا تھا۔ مگر اس فعل کو تم یوں تو جائز کہو گے مگر اس کے مرتکب کے بارہ میں ساتھ ہی نفرت بھی پیدا ہوگی حالانکہ اس نے اپنا حق حاصل کیا۔ حکومت کے کہنے پر لیا اور سپاہی کو ساتھ لے کر لیا مگر باوجود ان تمام باتوں کے تمہارے دل میں اس سے ہمدردی نہیں ہوگی۔ تمہارے دل کی ہمدردی اسی شخص کے ساتھ ہوگی جس نے دوسرے کا مال کھا لیا۔ اس کے مقابلہ میں جس شخص نے چوری کی تھی اس کا فعل گو برا ہے مگر تمہارے دل میں اس سے نفرت پیدا نہیں ہوگی بلکہ اگر تمہارا دل ٹھیک ہے اور تمہارا دماغ درست ہے تو تمہارے دل میں رحم پیدا ہوگا۔ پس خارجی اعمال کے مقابلہ میں قلوب کا انفعال ایک بسیط امر نہیں بلکہ مرکب امر ہے لیکن جہاں تک قضاء کا تعلق ہے۔ ہماری کوشش یہی ہونی چاہئے کہ نفس واقعہ سے ہم اِدھر اُدھر نہ ہوں۔ اگر ایک چور چوری کر کے آتا ہے اور ہم قاضی ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے سزا دیں۔ اگر ایک قاتل قتل کر کے آتا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کے فعل سے بیزاری کا اظہار کریں۔ اگر کوئی دوسرے سے کچھ روپیہ وصول کرنے کا حق رکھتا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم وہ روپیہ وصول کرانے میں اس کی مدد کریں۔ پس قضاء کے سلسلہ میں ہمارا فرض ہے کہ ہم نفسِ واقعہ سے کبھی اِدھر اُدھر نہ ہوں۔ گو اس میں بھی بعض دفعہ مجبوری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور قضاء میں واقعات کی مجبوری کو تسلیم کر کے دوسرے واقعات کو مدنظر رکھ لینا پڑتا ہے۔ جیسے قانونِ انگریزی میں یہ

بات داخل ہے کہ اگر نہائت اشتعال کی حالت میں کوئی شخص قتل کر دے تو اسے پھانسی کی سزا نہیں دیتے بلکہ قید کی سزا دیتے ہیں کیونکہ جج کہتے ہیں یہ ایک قسم کی دیوانگی ہے۔ جس کے نتیجہ میں اس نے اس فعل کا ارتکاب کیا۔ ہم اسے قاتل سمجھتے اور اس کے وجود کو سوسائٹی کے لئے مضر سمجھتے ہیں مگر ہم اسے پھانسی کی سزا نہیں دے سکتے کیونکہ اس نے انتہائی مجبوری کی حالت میں سخت مشتعل ہو کر اس فعل کا ارتکاب کیا۔ چنانچہ وہ اسے عمر قید کی سزا دے دیتے ہیں یا دس بارہ سال قید کی سزا دے دیتے ہیں حالانکہ وہ قاتل ہوتا ہے مگر اس کی دماغی طور پر جو مجبوری کی حالت ہوتی ہے اسے قانون تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے فیصلے بہت محدود ہونے چاہئیں ورنہ انصاف کا خون ہو جائے گا۔ اسی لئے قتل کے مقدمات میں بہت شاذ اس قانون کا استعمال کرتے ہیں۔ عام طور پر قتل کی سزا میں پھانسی کی سزا ہی تجویز کرتے ہیں۔ تو گو قضا کے لحاظ سے کوشش یہی ہونی چاہئے کہ نفسِ واقعہ سے انسان اِدھر اُدھر نہ ہو مگر اس میں بعض دفعہ مجبوری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ شدید اشتعال کی حالت میں قتل کی مثال مَیں نے بیان کی ہے یا جیسا کہ حال میں ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ ہؤا ہے۔ جس میں اسی بات پر عمل کیا گیا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ بٹالہ کے ایک مجسٹریٹ نے ایک مقدمہ کے دوران میں یہ لفظ کہے۔ کہ مسلمان جو حضرت باوا نانک رحمۃ اللہ علیہ کو مسلمان کہتے ہیں، یہ سکھوں کو بُرا لگتا ہے اور یہ ایسا ہی ہے۔ جیسے نَعُوْذُ بِاللّٰہِ کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کافر کہہ دے۔ ''الفضل'' نے اس پر بعض مضامین لکھے۔ جن میں مجسٹریٹ کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کیا اور لکھا کہ یہ بہت ناشائستہ الفاظ ہیں اور مجسٹریٹ سے اس کے متعلق بازپُرس ہونی چاہئے۔ اس پر گورنمنٹ نے ہائی کورٹ میں الفضل کے خلاف اس بناء پر مقدمہ چلا دیا کہ اس کے ایڈیٹر اور پرنٹر و پبلشر نے عدالت کی ہتک کی ہے اور انہیں سزا ملنی چاہئے کیونکہ انہوں نے مجسٹریٹ کے متعلق یہ لکھ دیا ہے کہ اس نے ناشائستہ الفاظ کہے ہیں۔ ہائی کورٹ والوں نے اس کے متعلق پہلے کچی پیشی رکھی۔ دو جج سماعت کے لئے موجود تھے۔ ایک مسٹر جسٹس ایڈیسن صاحب اور دوسرے مسٹر جسٹس دین محمد صاحب گورنمنٹ کی طرف سے اس کا سب سے بڑا وکیل ایڈووکیٹ جنرل پیش ہؤا اور اس نے ہائی کورٹ کو توجہ دلائی۔ کہ ایڈیٹر الفضل کو بلا کر بازپُرس کرنی چاہئے اور

ہتکِ عدالت کے جُرم میں اسے سزا دینی چاہئے۔ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے ہائی کورٹ کے ججوں نے اس موقع پر ایڈووکیٹ جنرل کی تقریر سُننے کے بعد کہا کہ یہ جُرم اصطلاحی طور پر جُرم ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ مضامین میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں یہ استعمال نہیں کرنے چاہئیں تھے مگر جو الفاظ مجسٹریٹ نے استعمال کئے ہیں ان کو سن کر بھی ایک مسلمان کا بے قابو ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ پس اگر آپ زور دیتے ہیں تو ہم اسے بلا تو لیں گے۔ مگر یہ جُرم صرف اصطلاحی جُرم ہوگا اور ہم اسے صرف نام کی سزا دیں گے مگر اس کے ساتھ ہی نہائت سخت ریمارکس مجسٹریٹ کے متعلق اپنے فیصلہ میں لکھیں گے۔ اس پر گورنمنٹ ایڈووکیٹ کچھ ڈھیلے ہوئے اور ججوں نے الفاظ میں فیصلہ کر دیا کہ ہم سمجھتے ہیں اگر ہم نے ایڈیٹر ''الفضل'' کو بلایا تو ہم اسے سزا دینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے اس لئے اس مقدمہ کو خارج کرتے ہیں۔ گویا انہوں نے ایک طرف جُرم کو تسلیم کیا مگر ساتھ ہی کہا کہ حالات ایسے ہیں کہ ہماری ہمدردی مجرم کی طرف جارہی ہے اور صاف کہہ دیا کہ اگر ہم اسے بلائیں گے تو صرف NOMINAL سزا دیں گے مگر دوسرے کے متعلق ہمارا رویہ سخت اظہارِ نفرت کا ہوگا اس لئے یہی بہتر ہوگا کہ اسی مرحلہ پر اس مقدمہ کو چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے مقدمہ خارج کر دیا۔ اس فیصلہ کے ساتھ ججوں نے یہ ثابت کر دیا کہ قانون، انصاف اور انسانیت کے اعلیٰ اخلاق بیک وقت ایک وجود میں جمع ہو سکتے ہیں۔ اور ایسے ہی فیصلے ہوتے ہیں جو قضاء کے رُعب کو دنیا میں قائم رکھتے ہیں۔ قضاء کا رعب صرف پھانسیاں دیتے جانے سے نہیں ہوتا بلکہ ایسے فیصلوں سے ہوتا ہے جہاں انسانی فطرت کا مطالعہ کر کے صحیح راستہ اختیار کیا جائے، خواہ سختی کا ہو خواہ نرمی کا۔

تو فیصلوں کے لحاظ سے ہمارا پورا فرض ہے کہ جو جُرم ہے اسے جُرم کہیں اور جو نیکی ہے اسے نیکی کہیں لیکن جب ہم جذبات کی دنیا میں آتے ہیں تو معاملہ بہت زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے کیونکہ ہر شخص کے اندر اللہ تعالیٰ نے دو مجسٹریٹ پیدا کئے ہیں۔ ایک دماغی مجسٹریٹ ہوتا ہے اور ایک جذباتی مجسٹریٹ ہوتا ہے۔ دماغی مجسٹریٹ کا کام زیادہ آسان ہوتا ہے مگر جذباتی مجسٹریٹ کا فیصلہ بہت پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ جب انسان دماغی مجسٹریٹ کے بعد جذباتی مجسٹریٹ کے محکمہ میں آتا ہے تو چونکہ انسانیت قضاء کے ذریعہ سے اپنا حق ادا کر چکتی ہے اس لئے اب وہ

چھلکے کو چھوڑ کر مغز کی طرف توجہ کرتی ہے اور اب وہ بسیط مسئلہ ایک پیچیدہ سوال کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اب صرف یہ سوال نہیں ہوتا کہ زید نے چوری کی ہے یا نہیں، بلکہ یہ سوال ہوتا ہے کہ اس نے کیوں چوری کی۔ اب صرف یہ سوال نہیں ہوتا کہ زید نے مارا پیٹا ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر اس نے مارا ہے تو کیوں؟ اسی طرح صرف یہ سوال نہیں ہوتا کہ زید نے کسی کو بُرا بھلا کہا ہے یا نہیں، بلکہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے اگر بُرا بھلا کہا ہے تو کیوں کہا ہے۔ تو جذبات کی دنیا میں بہت سی باتیں سامنے آ جاتی ہیں۔ مثلاً یہی کہ فعل کے محرکات کیا ہیں، اس نے کن حالات میں اس فعل کا ارتکاب کیا ہے، اسے کسی نے انگیخت کی ہے یا نہیں اور اگر کسی نے انگیخت کی تھی تو وہ معمولی انگیخت تھی یا زبردست اور وہ اس انگیخت کا آسانی سے مقابلہ کر سکتا تھا یا نہیں، پھر یہ کہ فاعل کا ماحول کیسا تھا اور اگر اس نے بدی کی تو کن حالات میں کیونکہ ماحول سے بھی کسی کی مجبوری یا عدمِ مجبوی ظاہر ہو جاتی ہے۔ ایک شخص نمازی ہوتا ہے مگر نمازیوں کے گھر میں اور دوسرا شخص نمازی ہوتا ہے مگر بے نمازیوں کے گھر میں۔ اب یہ یقینی بات ہے کہ اس کی نماز زیادہ اعلیٰ درجہ کی ہے جو بے نمازوں میں رہ کر باقاعدہ نماز پڑھتا ہے بہ نسبت اس شخص کے جو ایسے ماحول میں ہے جہاں تمام لوگ التزام کے ساتھ نماز پڑھنے کے عادی ہیں۔ اسی طرح اس کی مجبوریاں دیکھی جائیں گی، اس کا نقطۂ نگاہ دیکھا جائے گا کیونکہ نقطۂ نگاہ کے بدل جانے سے بھی بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ اور پھر گو جُرم رہ جاتا ہے مگر اس کے متعلق نفرت کم ہو جاتی ہے۔ جیسے پٹھانوں میں یہ دستور ہے کہ جب ان میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اٹھ کر اسے قتل کر دیتے ہیں اور اسے بالکل جائز سمجھتے ہیں۔ اب ایک ہی فعل اگر ایک پٹھان کرے گا تو گو اس کے متعلق بھی ہمارے دل میں نفرت پیدا ہوگی مگر وہ اتنی نہیں ہوگی جتنی اس وقت پیدا ہوگی جب ایک پنجابی ایسی ہی حرکت کرے گا کیونکہ پنجابی کا نقطۂ نگاہ اَور تھا اور پٹھان کا اَور یا سکھ اور عیسائی سؤر کھاتے ہیں اور ہم سب اسے جانتے ہیں۔ اب سؤر کھانا یقینی طور پر بُری بات ہے۔ مگر ایک سکھ یا عیسائی کو سؤر کھاتے دیکھ کر ہمارے دل میں وہ جذبات نفرت پیدا نہیں ہونگے جو ایک مسلمان کو سؤر کھاتے دیکھ کر پیدا ہوں گے حالانکہ فعل ایک ہی ہے وہ بھی سؤر کھا رہا ہے اور یہ بھی سؤر کھا رہا ہے۔ ایک ہندو نماز نہیں پڑھتا اور ہم

جانتے ہیں کہ یہ بُری بات ہے۔ مگر ایک ہندو کو نماز نہ پڑھتے دیکھ کر ہمارے دل میں وہ نفرت پیدا نہیں ہوگی جو ایک مسلمان کو نماز نہ پڑھتے دیکھ کر پیدا ہوگی کیونکہ ان دونوں کے نقطہ نگاہ میں فرق ہے۔ وہ نماز پڑھنا ضروری نہیں سمجھتا اور یہ نماز کو ضروری سمجھنے کے باوجود سُستی کی وجہ سے نماز نہیں پڑھتا۔ پھر اس کی تعلیم کو دیکھا جائے گا کہ وہ پڑھا لکھا ہے یا جاہل، اس کے پسماندگان کی حالت دیکھیں گے کہ کیسی ہے کیونکہ یہ بات بھی جذبات کو بالکل بدل دیتی ہے۔ اگر ایک بڑے سے بڑا ڈاکو ہو اور فرض کرو اس کی بیوی مری ہوئی ہے اور اس کا صرف ایک ہی بچہ ہے اور وہ بھی چار پانچ سال کا اور پھر وہ بھی آنکھوں سے اندھا تو جس وقت اس ڈاکو کو پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہو اور اس کا بیکس یتیم اور اندھا بچہ رو رہا ہو اس وقت تم میں سے کون ہے جس کا دل رحم سے نہیں بھر جائے گا۔ پس پسماندگان کی حالت بھی قلبی کیفیات کو بدل دیتی ہے۔ اسی طرح اس کے دوسرے افعال کو بھی دیکھنا پڑے گا۔ ایک وہ ہوتا ہے جو عادی طور پر چوری کرتا ہے اور ایک وہ ہے جو یوں تو بڑا نیک تھا مگر کسی بات سے مجبور ہو کر انتہائی لاچاری کی حالت میں اس نے چوری کر لی۔ یا ایک وہ ہے جو ہمیشہ دوسروں سے لڑتا رہتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو ہے تو بڑا رحم دل مگر اتفاقی طور پر ایک دفعہ جوش میں آ کر وہ دوسرے سے لڑ پڑا ہے۔ اب گو ان دونوں سے ایک ہی قسم کا جُرم سرزد ہؤا ہو مگر ایک کے متعلق ہمارے جذبات بالکل اور قسم کے ہوں گے اور دوسرے کے متعلق ہمارے جذبات اور قسم کے ہوں گے۔ پھر جس کے خلاف حملہ ہؤا ہے اس کے حالات اور اس کے پسماندگان کے حالات بھی دیکھے جائیں گے۔ بظاہر جس طرح ایک آدمی قتل ہو جاتا ہے اسی طرح دوسرا آدمی بھی قتل ہوتا ہے مگر ایک آدمی ایسا ہوتا ہے جس پر ملک کا انحصار ہوتا ہے اور دوسرا آدمی معمولی اور نکمّا ہوتا ہے۔ ایک کے قتل ہونے پر اتنا شور پڑتا ہے کہ تمام ملک ایک سِرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہل جاتا ہے اور دوسرے آدمی کے قتل ہونے پر کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں فعل اپنے اثرات کے لحاظ سے یکساں ہیں۔ پنڈورہ میں اک چوہڑہ دوسرے چوہڑے کو قتل کر دیتا ہے تو گاؤں سے باہر اس کے قتل ہونے کی خبر تک نہیں جاتی۔ مگر ملک کا کوئی خادم مارا جاتا ہے تو تمام ملک اس آواز سے گونج اُٹھتا ہے۔ بے شک ایسے مواقع پر ایک چوہڑے کے قاتل کو بھی وہی سزا ملے گی

جو ایک خادم ملک کے قاتل کو ملے گی مگر ہمارے قلب کا فیصلہ صرف جُرم کے لحاظ سے نہیں ہوگا بلکہ ان اثرات کے لحاظ سے ہوگا جو ان قتلوں کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں پس جہاں تک قضاء کا تعلق ہے وہاں دونوں کو یکساں سزا ملے گی مگر جہاں جذبات اوراحساسات کا سوال آ جائے گا وہاں ان دونوں قتلوں کے تاثرات میں زمین وآسمان کا فرق ہوگا۔

پھر یہ بھی دیکھا جائے گا کہ جس پر حملہ ہؤا ہے وہ حملہ ہونے کے وقت جواب دینے کے قابل تھا یا نہیں۔ آیا اس پر ایسی حالت میں تو حملہ نہیں ہؤا جب کہ وہ سورہا تھا یا اسے رسیوں سے باندھ کر آگ میں تو نہیں جلایا گیا۔ اور اگر ہمیں معلوم ہؤا کہ اس پر سوتے ہوئے حملہ کیا گیا ہے یا رسیوں سے باندھ کر آگ میں جلایا گیا ہے اور اس طرح بے بسی کی حالت میں اسے قتل کیا گیا ہے تو اس قسم کے جرائم زیادہ خطرناک سمجھے جائیں گے۔ پھر یہ بھی دیکھا جائے گا کہ آگے سے اس نے یا اس کے ساتھیوں نے کوئی جواب دیا ہے یا نہیں۔ غرض جذبات کی دنیا میں معاملہ زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اور اب صرف فعل نہیں بلکہ فعل کے محرکات، فاعل کا ماحول، اس کی مجبوریاں، اس کا نقطہ نگاہ، اس کی تعلیم، اس کے پسماندگان کی حالت، اس کے دوسرے افعال جس کے خلاف حملہ ہؤا ہے، اس کے حالات، اس کے پسماندگان کے حالات۔ اگر وہ ہلاک ہؤا ہے تو دنیا کو جو اس کی ہلاکت سے نقصان پہنچتا ہے، اس کا اندازہ، حملہ ہونے کے وقت وہ جواب کے قابل تھا یا نہیں، آگے سے اس نے یا اس کے ساتھیوں نے کوئی جواب دیا یا نہیں۔ بیسیوں باتیں ہیں جو سامنے آ جاتی ہیں اور ان بیسیوں باتوں کو جو مشترک نتیجہ ہوگا وہ ہمارے دل کا ردِعمل ہوگا۔ اسی وجہ سے بعض دفعہ ایک برے فعل کو ہم برا سمجھتے ہیں مگر دل میں اس فعل کا ارتکاب کرنے والے سے ہمدردی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور بعض دفعہ ظاہری نگاہ سے اچھا نظر آنے والے ایک فعل کو ہم اچھا کہتے ہیں مگر دل میں اس فعل کا ارتکاب کرنے والے کے متعلق نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ان میں درجوں کا فرق ہوگا۔ کسی وقت ہماری ہمدردی بہت زیادہ ہوگی اور کسی وقت کم، کسی وقت زیادہ نفرت ہوگی اور کسی وقت تھوڑی۔ غرض جس وقت جذبات فیصلہ کرنے لگتے ہیں اور وہ چھلکے کو چھوڑ کر مغز کی طرف آتے ہیں، اس وقت اصل واقعہ ایک وسیع کُل کا چھوٹا سا جزو ہو کر رہ جاتا ہے اور قلبی تأثرات سارے کُل کا نتیجہ

ہوتے ہیں۔خالی واقعہ کے ایک جُزو کا نتیجہ نہیں ہوتے۔جب ہم قضاء کی کرسی پر بیٹھیں گے تو قتل کا واقعہ ایک عمارت کی شکل میں ہمارے سامنے ہوگا مگر جب ہم جذبات کی کرسی پر بیٹھیں گے تو وہی عمارت ایک کھڑکی یا کنڈا بن کر رہ جائے گی۔اور یہ تاثرات جو دل میں پیدا ہوتے ہیں اگر واقعات کے طبعی نتائج ہوں یعنی انصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے تمام باتوں کو سوچا ہوا اور ان کے ماتحت ہمارے دل میں ایک تاثر پیدا ہوا ہو تو ایسے تاثرات کبھی قابلِ اعتراض نہیں کہلا سکتے بشرطیکہ ان تاثرات کو قضاء میں دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔چنانچہ ایسے واقعات عدالتوں میں بھی کثرت سے ہوتے ہیں کچھ مدت کی بات ہے لاہور کے ایک انگریز جج نے ایک شخص کو سزا دی مگر فیصلہ میں لکھا کہ میں اسے قانونی سزا دیتا ہوں ورنہ میرے نزدیک یہ جُرم اس نوعیت کا نہیں کہ اسے سزا دی جائے مگر چونکہ قانون کہتا ہے کہ سزا دو اس لئے میں اسے اتنے روپے جرمانہ کی سزا دیتا ہوں۔جرمانہ کے بعد اس نے نوکر کو بلایا اور کہا میرا کوٹ جو فلاں کھونٹی پر لٹک رہا ہے وہ لے آؤ۔چنانچہ وہ کوٹ لایا اور اس جج نے جیب میں سے اتنا روپیہ نکال کر جتنا اس نے جُرمانہ کیا تھا ملزم کی طرف سے خزانے میں داخل کرا دیا۔اب دیکھو ایک ہی وقت اس نے دونوں امور کو ملحوظ رکھا۔اس نے جرمانہ کیا قضاء کے تقاضا کو پورا کرنے کے لئے اور اس نے خود جُرمانہ ادا کیا اپنے جذبات کو تسلی دینے کے لئے۔

وکٹر ہیوگو فرانس کا ایک مشہور مصنف گزرا ہے بلکہ موجودہ دورِ تصنیف کا وہ بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔اس نے بہت سے تاریخی ناول لکھے ہیں جن میں واقعات تمام تاریخی ہوتے ہیں صرف ان کے بیان کرتے وقت وہ رنگ آمیزی کر لیتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس کے قلم میں بڑی تاثیر پیدا کی ہے چنانچہ اسے وفات پائے گو عرصہ گزر گیا ہے مگر آج تک اس کی تحریریں علمی مذاق رکھنے والوں میں بڑی مقبول ہیں۔فلسفے کے بڑے بڑے نکتے ہیں جن کا اس نے اپنی کتابوں میں حکایات میں ذکر کیا ہے۔ان میں اس مضمون کے متعلق بھی ایک تاریخی قصہ آتا ہے۔فرانس میں اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں بڑی بغاوتیں ہوئی تھیں اور بڑے قتل اور خونریزیاں ہوئی تھیں۔ایک موقع پر جو پرانا شاہی خاندان تھا اسے جب لوگوں نے فرانس سے نکال دیا تو اس خاندان کے کچھ افراد انگلستان چلے گئے اور کچھ بیلجیم میں

مقیم ہو گئے اور وہاں بیٹھ کر انہوں نے سازشیں شروع کر دیں۔اس موقع پر قصہ یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک نواب کے خورد سال بھتیجے کو جو اسی نواب کا وارث تھا، ایک استاد رکھ کر تعلیم دلائی گئی۔استاد دل میں جمہوریت کا قائل تھا۔اس نے اسے جس قدر تعلیم دی وہ جمہوریت کے اصول پر دی۔ملک کے حقوق اس کے ذہن نشین کئے اور اس عمدگی سے وہ اصول اس کے ذہن میں داخل کئے کہ وہ ان کا اچھا خاصہ مبلغ ہو گیا۔چنانچہ جہاں بیٹھتا انہی اصول کی لوگوں کو تلقین کرتا۔جب بغاوت ہوئی تو قدرتی طور پر وہ عوام الناس کے ساتھ مل گیا اور اپنے بھائی بندوں کو اس نے چھوڑ دیا۔ایک موقع پر ایسا اتفاق ہؤا کہ اس کا وہ چچا جس نے اسے پالا تھا لڑائی میں اس کے مقابل میں آ گیا اور آخر شکست کھا کر وہ گرفتار کر لیا گیا۔جب اس کا چچا پکڑا گیا تو چونکہ اس نے بچپن سے اسے پالا تھا، اس لئے بھتیجے کے دل میں محبت کے جذبات نے جوش مارا اور اس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ ملک کی خیر خواہی کا جو فرض مجھ پر عائد ہوتا تھا وہ تو میں ادا کر چکا ہوں اور اب میں اپنا ذاتی فرض بھی ادا کر دوں۔قید خانہ میں جا کر اپنے چچا کو چھوڑ دیا۔اس پر تمام ملک میں شور پڑ گیا اور فرانس کی پارلیمنٹ میں مقدمہ پیش ہؤا۔انہوں نے ایک کمیشن تجویز کیا اور اسی استاد کو جس نے اسے تعلیم دی تھی اس مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لئے جج مقرر کیا۔چونکہ اس نے ملک کے لئے بڑی قربانیاں کی تھیں اس لئے فوج کے بڑے بڑے افسر وفد بن کر اس کے پاس گئے اور کہا کہ اس کی گزشتہ خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے متعلق نرم فیصلہ کیا جائے مگر اس نے ان کی ایک نہ سنی اور فیصلہ کیا کہ اسے گولی سے اڑا دیا جائے اور کہا کہ اس کے فعل کے نتیجہ میں جو کشت وخون ہو گا اس کا کیا علاج ہے۔چنانچہ اس فیصلہ کے مطابق اسے ایک جگہ کھڑا کیا گیا اور بندوقوں کی باڑ مار کر اسے مار دینے کا حکم ملا۔طریق یہی ہے کہ جب باڑ مارتے ہیں تو درجن بھر یا کم وبیش تعداد سپاہیوں کی صف باندھ کر مجرم پر حکم ملتے ہی گولیاں چلاتی ہے اور اس سے غرض ایک تو رُعب قائم کرنا ہوتا ہے دوسرے یہ احتیاط ہوتی ہے کہ بیک وقت کئی سپاہی نشانہ لیں گے تو نشانہ خطا نہ ہو گا اور مجرم ضرور مر جائے گا۔جب اس نواب زادہ کو میدان میں کھڑا کیا گیا اور سپاہی بھی مختلف جگہوں پر متعین کر دیئے گئے تو پھر بڑے بڑے افسروں کا ایک وفد اس استاد کے پاس گیا اور اس نے کہا ہماری ساری فتح اسی کے

طفیل ہے۔اس نے بادشاہی تعلقات کی کبھی پرواہ نہیں کی اور ہمیشہ ہمارا ساتھ دیتا رہا اب اس کے ساتھ رعائت کی جائے اور اسے یہ سزا نہ دی جائے۔مگر اس نے ان کی کوئی بات نہ سُنی اور کہا گولی چلاؤ۔ چنانچہ سپاہیوں نے باڑ ماردی اور وہ رئیس مرکر گر پڑا۔ادھر استاد کے منہ سے اس مفہوم کا ایک فقرہ نکلا۔ کہ آہ میری امیدوں کی عمارت منہدم ہوگئی اور ایک پستول چلنے کی آواز آئی۔لوگوں نے مڑکر دیکھا۔تو اس رئیس کی لاش کے ساتھ استاد کی لاش بھی تڑپ رہی تھی۔اور وہ بھی اس کے غم میں خودکُشی کر چکا تھا۔

یہ واقعہ گو ایک ناول میں بیان ہوًا ہے لیکن تاریخی مواد سے ماخوذ اس میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانی فیصلہ بعض دفعہ متضاد حالات میں ہوتا ہے۔قضاء اَور طرف جاتی ہے اور جذبات اور طرف جاتے ہیں اور اس میں بتایا گیا ہے کہ انسانی روح بعض فعلوں سے دوطرح متأثر ہوتی ہے۔ایک قضائی طور پر اَور ایک جذباتی طور پر۔ چنانچہ اسی بناء پر اس فرانسیسی بغاوت کے لیڈر نے بھی ایک طرف سزا کا حکم دیا کیونکہ قضاء کا یہی فیصلہ تھا کہ جو شخص اپنے مُلک سے ایسی غداری کرے، اُسے ایسی ہی سزا ملنی چاہئے۔دوسری طرف چونکہ اس نے اسے ایک بچے کی طرح پالا تھا اور اُس کے ساتھ اُس کی امیدیں وابستہ تھیں جب اس نے دیکھا کہ وہ ایک خطا کی وجہ سے مارا گیا ہے تو چونکہ ان کے مذہب میں خودکشی ناجائز نہیں اس لئے اس نے بھی خودکشی کرلی۔

غرض تاریخی واقعات اور روزمرہ کے واقعات سے یہ امر پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔کہ انسانی روح بعض افعال سے دوطرح متأثر ہوتی ہے۔ایک قضائی طور پر اور ایک جذباتی طور پر۔بعض دفعہ قضائی فیصلہ بالکل اور ہوتا ہے اور جذباتی فیصلہ بالکل اور ہوتا ہے۔اور کبھی یہ دونوں فیصلے موافق بھی ہوتے ہیں مگر بہرحال دیانت دار انسان وہ ہوتا ہے جو قضائی حصہ کو جذباتی حصہ سے مغلوب نہ ہونے دے۔بے شک جذباتی حصہ پیدا ہوگا اور ضرور ہوگا مگر انسان کا کام یہ ہے کہ اس سے مغلوب نہ ہو۔ایک جج کے سامنے اگر اس کا بیٹا ملزم کی حیثیت میں پیش ہوگا تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے دل میں رحم پیدا نہیں ہوگا مگر بطور جج کے اس کا فرض ہے کہ اسے سزا دے۔مگر کیا جب وہ سزا دے گا اسے غم نہیں ہوگا، ہوگا اور ضرور ہوگا مگر کیا

غم بھی کوئی جُرم ہے۔ ہر شخص تسلیم کرے گا کہ جب اس نے اپنے قضائی فرض کوادا کر دیا تو اب اس کا اظہارِ غم کوئی ناجائز امر نہیں پس جب ایک جج قضائی طور پر اپنا فرض ادا کر لیتا ہے اور ناجائز طور پر دوسرے کے حقوق کو چھیننے کی کوشش نہیں کرتا۔ مثلاً یہ نہیں کرتا کہ اسے قید سے چھڑا لے (مقدمہ لڑنا ناجائز نہیں کیونکہ جُرم کا اثبات فیصلہ کے بعد ہوتا ہے پہلے نہیں) تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کرے۔ بشرطیکہ وہ جذبات جادۂ اعتدال اور صداقت پر ہوں۔ صداقت پر اس طرح کہ جن جذبات سے وہ نتیجہ نکالتا ہے وہ صحیح ہوں اور جادۂ اعتدال پر اس طرح کہ جذبات حد سے آگے نہ نکل جائیں اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اُس کا یہ فعل انسانیت کے خلاف نہیں بلکہ اس کے عین مطابق ہوگا۔ اگر ایک باپ قاضی ہے اور اس کا بیٹا مجرم کی حیثیت میں اُس کے سامنے پیش ہے اور وہ اسے قانون کے مقتضٰی کو پورا کرنے کے لئے سزا دیتا ہے مگر اُس کا دل زخمی ہے تو جب اُس نے قانون کو پورا کر دیا تو اُس کا رنج اس کی نیکی کے منافی نہیں بلکہ عین مطابق ہے کیونکہ اُس نے ثابت کر دیا کہ وہ جج بھی ہے اور انسان بھی۔ اور اگر کوئی شخص جذباتی حصہ کو ظاہر کرنا بھی نیکی کے منافی سمجھتا ہے تو وہ احمق اور بے وقوف ہے اور اس بات کو ثابت کرنے والا ہے کہ وہ اپنے دماغ کو پڑھنے کے قابل نہیں۔ اگر دُنیا کے سارے مجسٹریٹ بھی مل کر یہ کہیں کہ اگر ان ججوں کے بیٹوں میں سے کسی سے کوئی جُرم سرزد ہو اور فیصلہ کرتے وقت سزا بھی دیتے ہیں اور ان کے دل میں یہ احساس بھی پیدا نہیں ہوتا کہ کاش! ہمارا بیٹا بچ جاتا، کاش وہ اس جُرم کا ارتکاب نہ کرتا۔ یا یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ کاش! اسے توبہ کی توفیق مل جائے تا اگر اس کی دنیا نہیں سنور سکی تو آخرت ہی سنور جائے۔ یا اگر سزا مل جاتی ہے تو ان کے دلوں میں یہ حسرت پیدا نہیں ہوتی کہ آہ افسوس ہمارا بچہ گناہ سے نہ بچ سکا تو مَیں ان سے یہ کہوں گا کہ تم اپنے دماغ کو خود پڑھنے کی اہلیت نہیں رکھتے یا تم انسان نہیں بلکہ انسانیت سے بالا کوئی اَور ہستی ہو۔ مگر میں نہیں سمجھ سکتا دنیا میں دل اور دماغ رکھنے والے ایسے مجسٹریٹ بھی ہو سکتے ہوں جو قضاء سے اپنے جذبات کو کُچل دیں اور ان کے دلوں میں کوئی رحم پیدا نہ ہو، میں اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ ایک قانون ہے جس سے باہر کوئی نہیں جا سکتا۔ ہزارہا مثالیں روزانہ اس کی ملتی ہیں۔ صحابہؓ کا ہی واقعہ ہے۔ مقدادؓ ایک بہت بڑے صحابی تھے

وہ ایک دفعہ ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص پاس سے گزرا اور کہنے لگا۔ میں قربان جاؤں ان آنکھوں کے جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ میں قربان جاؤں ان ہاتھوں کے جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی۔ کاش! ہم بھی اُس زمانہ کو دیکھتے۔ مقدادؓ یہ سن کر غصہ میں آ گئے اور ان کا چہرہ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ راوی کہتے ہیں۔ ہم نے دل میں کہا آپ کا یہ غصہ اِس وقت کیسا ناواجب ہے مگر اتنے میں مقدادؓ بولے۔ تم کیا بات کرتے ہو۔ تمہارے جیسے ہی انسان تھے جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ردّ کیا۔ انہوں نے آپ کی باتیں سنیں مگر کہا تُو جھوٹا ہے، مکار ہے۔ پس تم میں سے کون کہہ سکتا ہے کہ اگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت ہوتا تو ضرور آپ پر ایمان لاتا اور ابوجہل یا ابولہب کے چیلوں میں شامل نہ ہوتا۔ پس تم کیوں کہتے ہو کہ کاش ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوتے۔ تمہیں کیا معلوم ہے کہ اگر اُس وقت تم پیدا ہوتے تو تمہارا کیا حال ہوتا۔ تم شکر کرو کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں ایسے وقت میں پیدا کیا ہے جب تمہارے ماں باپ ایماندار تھے اور اس طرح تمہیں اس امتحان میں سے گزرنا نہیں پڑا جس امتحان میں سے تمہارے ماں باپ کو گزرنا پڑا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ تم ہمارے زمانہ کا کیا پوچھتے ہو۔ ہمارے دل بھی تھے، ہمارے بھی پیارے سے پیارے وجود تھے۔ ہمارے بھی دنیا میں وہ لوگ تھے جو ہمارے حبیب اور محبوب تھے مگر جب خدا نے ہمیں ایمان دے دیا اور وہ دولتِ ایمان سے محروم رہے اور جنگیں ہوئیں تو ہم ان سے لڑائی کرتے تھے مگر بخدا جب ہم تلوار چلاتے تو ہمارے دل یہ تصور کر کے خون ہو جاتے کہ قیامت کے دن ہمارے یہ حبیب دوزخ کی طرف لے جائے جا رہے ہوں گے اور ہم جنت کی طرف جا رہے ہوں گے۔ یہ وہ نمونہ ہے جو صحابہؓ نے دکھایا اور یہی وہ نمونہ ہے جو قضاء کے وقت ایک شریف اور ہمدرد انسان دکھا سکتا ہے انہوں نے ایک طرف تلوار لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو کاٹ ڈالا مگر دوسری طرف ان کی حالت یہ تھی کہ ان کے دل کُڑھ رہے اور رو رہے تھے کہ ہمارا یہ پیارا جہنم کی طرف جا رہا ہے اور ہم جنت کی طرف۔ تو جذباتی قضاء کا معاملہ نہایت پیچدار ہوتا ہے جس کو صرف عالم اور فہیم آدمی ہی سمجھ سکتے ہیں۔ صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے سوچنے والا دماغ اور فکر کرنے والی روح عطا فرمائی ہے۔ عام لوگ نہ ان باتوں کو سمجھتے ہیں اور نہ وہ ان کو سمجھنے کے

اہل ہوتے ہیں۔غرض دیانت دار انسان وہ ہوتا ہے جو قضائی حصے کو جذباتی حصہ سے مغلوب نہ ہونے دے لیکن جب وہ یہ مطالبہ پورا کردے تو اور اس پر کوئی بوجھ نہیں بشرطیکہ اس کے جذبات جادۂ اعتدال اور صداقت پر ہوں۔ اگر وہ جذبات صداقت پر مبنی ہوں اور اگر وہ جادۂ اعتدال پر قائم ہوں تو نہ صرف یہ کہ وہ خلافِ انسانیت نہیں بلکہ وہ عین انسانیت ہیں۔ یہ تین اصل ہیں جنہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے تب وہ جواب سمجھ آئے گا جو ان سوالات کا میں دینا چاہتا ہوں۔مگر چونکہ آج بہت دیر ہوگئی ہے اس لئے اسی پر اپنا خطبہ ختم کرتا ہوں دوسرا حصّہ جو جواب پر مشتمل ہے وہ انشاء اللہ تعالیٰ اگلے خطبہ میں بیان کروں گا۔ ''

(الفضل ۳۰؍جون ۱۹۳۸ء)

۱؎ الدخان:۵۰

۲؎ بخاری کتاب الادب باب مَا یُنْھٰی عَنِ التَّحاسُدِ (الخ)

۳؎ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝۷ (النور:۷)